R.No. 2186/57 REGD. N.L. 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷۔ شمارہ ۴۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

غالب صدی کے کام

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر غالب صدی منانے کے لئے خاصے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا ہے اور ہر جگہ کوئی نہ کوئی پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ غالب پر کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔ رسالوں کے خاص نمبروں کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ غالب کی تصانیف کے نئے ایڈیشن نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں غالب کی اردو شاعری اور اردو نثر کے تراجم شایع کرنے کی بھی اسکیمیں ہیں۔ پھر ہر جگہ اس موقع پر مشاعرے ہوں گے۔ غالب پر فلم بھی تیار ہو رہی ہے۔ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں۔ ٹکٹ جاری کرنے کی بھی تجویز ہے۔ کچھ ادارے غالب ہال، غالب تھیٹر، غالب میوزیم بنانے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ غرض بہت سے کام سوچے گئے ہیں اور امید ہے کہ ان میں سے خاصے پورے بھی ہوں گے۔ ہندوستان سے باہر بھی خاصی تیاریاں ہیں۔ پاکستان کے پروگراموں کا جتنا علم ہمیں ہوا ہے اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں بھی خاصا جوش و خروش ہے اور خاصی تیاریاں ہیں۔ روس میں ایک کمیٹی بنی ہے جو وہاں کے لکھنے والوں اور اردو کے ممتاز ناقدوں کے مضامین روسی زبان میں شایع کرے گی۔ امریکہ میں چودھری محمد نعیم کی کوشش سے غالب پر انگریزی میں کچھ مضامین شایع کرنے کا پروگرام ہے۔ انگلستان میں لندن اور آکسفورڈ میں کچھ اردو دوست اپنا خصوصی پروگرام طے کر چکے ہیں۔ ایران والے بھی غالب کے فارسی کلام کا ایک نیا ایڈیشن شایع کر رہے ہیں۔

کاش ایسا ہوتا کہ سارے کام مربوط ہوتے اور مرکزی غالب کمیٹی ان کو منظم کرتی اور یہ کوشش ہوتی کہ تکرار نہ ہو اور اس موقع پر کام کی افادیت اور معنویت کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔ کاش غالب صدی اس طرح منائی جاتی کہ اس سے غالب کی زبان یعنی اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا۔ اس کی تعلیم اور چلن میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوتیں۔ کاموں میں تکرار سے بچا جاتا۔ غالب کے ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمے کی باقاعدہ اسکیم ہوتی اور ہر ریاست میں ذمہ دار افراد اس کام کو ہاتھ میں لیتے اور علاقائی زبان کے ادیبوں کی مدد اور تعاون سے اس زبان میں غالب کا ترجمہ شایع کرتے۔ اس کے ساتھ غالب کے ہم عصروں پر بھی توجہ ضروری تھی کیونکہ غالب نرے ہی کے چراغ نہیں تھے، ایک تاروں بھرے آسمان کا سب سے روشن ستارہ تھے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ سب کام ایک ہی تاریخ یعنی ۱۵ر فروری کو ذہن میں رکھ کر نہ کئے جائیں، بلکہ کاموں اور تقریبات کو پورے سال یعنی ۱۹۶۹ء پر پھیلایا جاتا تاکہ غالب صدی کا زیادہ سے زیادہ اثر ہوتا۔ یہ اب بھی ہو سکتا ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس طرح ہر رسالے کا ایسا غالب نمبر بھی زیادہ مفید نہیں ہے جس میں ادھر ادھر سے مضامین جمع کر لئے جائیں۔ خاص خاص پہلوؤں پر غائر نظر ڈالنا چاہئے اور ہر نمبر کی کوئی خصوصیت ہونی چاہئے۔ غالب کو اردو کے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا زیادہ ضروری ہے، کھینچ تان کر اسے جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کرنا یا ہندوستانی قومیت کا علمبردار ثابت کرنا زیادتی ہوگا۔ غالب کا ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ دور کا جلوہ تھا۔ اس طرح ان کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں اور اپنی شاعری کی وجہ سے آفاقی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ انسانیت کے درد و داغ اور سوز و ساز کے ترجمان ہیں اور یہی ان کی عظمت ہے۔ اس عظمت کو اجاگر کرنا چاہئے اور یہ عظمت بذات خود اپنا حق اپنا مطالبہ اور اپنا مقام رکھتی ہے۔ شمع کی اپنی روشنی کیا کم ہے۔ اسے مختلف رنگوں کے فانوس پہنانے کی کیا ضرورت۔ اسی طرح غالب کی یاد میں بہت سی عمارتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے ان کے کلام کو اور عام کرنے اور ہندوستانی زبانوں میں اور انگریزی میں ان کی عظمت کا احساس بڑھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔

باقی صفحہ ۱۱ سے آگے

داستان یا منظوم قصے سب کو پڑھ کر خوف و بیزاری اور کسی نادیدہ قوت سے گریز کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے کے شاعر معاملہ بندی اور شوخ بیانی سے معرا تھے لیکن ان میں ایک آسیب ضرور پوشیدہ تھا جو انھیں کبھی صحراؤں کی طرف کھینچتا تھا کبھی سینہ زنی کراتا تھا اور کبھی بے خواب راتوں میں خروشاں و فریاد کناں رکھتا تھا۔ یہ بات قدیم شاعری کے روایتی عاشقانہ رنگ کو پیش نظر رکھ کر نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ ایسے اشعار کو سامنے رکھ کر جن میں ایک عجیب انفرادی تڑپ اور معنوی گہرائی تھی۔ نظر رکھنے والے قارئین اسے مندرجہ ذیل اشعار میں آسانی سے پہچان لیں گے۔

سراج اورنگ آبادی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی نہ جنوں کی پردہ دری رہی نہ خرد کی بخیہ گری رہی

میر

دل تپ خوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل ڈھہا جائے ہے سحر سے آہ رات گزرے گی کس خرابی سے
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

درد

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ظفر

پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

ادب میں یہ انداز فکر کہاں تک صحیح یا غلط ہو سکتا ہے یہ ایک علیحدہ بحث ہے اس موقع پر صرف اس گہرے رشتے کی نشاندہی مقصود ہے جو ماضی میں صدہا سال تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب میں بھی یہ رجحان موجود رہا ہے اور اس لحاظ سے ہمارے موجودہ ادب میں اس کی مماثلت نظر آتی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ اکثر اردو کے ادیبوں نے مغربی ادب پاروں کا براہ راست مطالعہ کر کے یہ اثر قبول کیا ہے لیکن یہ اثر اتنا دیرپا اور گہرا ہرگز نہ ہوتا اگر اس طرز فکر کا رشتہ خود ہمارے ماضی سے نہ ہوتا۔ اپنی ذات میں ڈوبنے اور اسے دریافت کرنے سے زندگی اور موت کے جو حقائق منکشف ہوتے ہیں اور ماورائی وسعتیں اپنی خاص ترتیب اور ترنم کے ساتھ جس طرح ادیب کے سامنے آتی ہیں اس کا تجربہ مشرقی ادب کا خاصہ رہا ہے اور یہ ہماری سرشت میں داخل ہے۔ بیدل کا یہ شعر اردو کے بیشتر ادیبوں کی نظر سے گزرا ہوگا لیکن کم لوگوں نے اس میں جدید شاعری کے "گلشن ناآفریدہ" کی آہٹ محسوس کی ہوگی سے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

آخر بیدل در دل کو کھول کر کس چمن کی سیر کرانا چاہتا تھا اس کا جواب مشہور مغربی مصنف رلکے RILKE کی زبان سے سنیے۔

"شاعر میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے بچپن کے دنوں کو واپس لا سکے جو عرصے سے ہو چکے ہیں وہ بچپن کی بیماریاں جو عجیب و غریب انداز سے شروع ہو کر گہری ارتقائی تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں وہ ایسے دنوں کی بازیافت کر سکے جو علیحدہ کمروں میں رہ کر خاموشی سے گزر گئے ہیں۔ سمندر کی وہ راتیں جو شان و شوکت کے ساتھ دوڑتی ہیں اور ستاروں کے ساتھ اڑتی ہیں تاہم اتنا سب سوچنا کافی نہیں ہے۔ محبت کی بہت سی راتوں کی یادیں ہونی چاہئیں ہر رات دوسری رات سے مختلف۔ عورتوں کی دردِ زہ کی چیخیں۔ ان کا زچہ خانے میں ہونا ہلکی پھلکی ہوئی اور خوابیدہ۔ اس نے مرتے ہوئے آدمی کو بھی دیکھا ہو اور لاش کے ساتھ کمرے میں بیٹھا ہو جس میں پر اسرار آوازیں ہوں اور جس کی کھڑکیاں کھلی ہوں اور صرف یادوں کا ہونا بھی کافی نہیں ہے شاعر میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ جب یہ یادیں زیادہ ہوں تو وہ انھیں بھلا سکے اور اتنا صبر ہو کہ ان یادوں کی واپسی کا انتظار کر سکے جب یہ یادیں ہمارے خون ہماری نظر اور ہمارے اطوار میں اس طرح حل ہو جائیں کہ ان میں اور اپنی ذات میں تمیز نہ کی جا سکے اس وقت ایسا ممکن ہے کہ کسی نایاب لمحہ میں شعر کا پہلا لفظ ان کے درمیان سے ابھر کر علیحدہ ہو۔"[1]

جن لوگوں نے بیدل کی نظم و نثر کا مطالعہ کیا ہے انھیں رلکے کے اس بیان میں بیدل کے شعری نظریہ کا واضح عکس نظر آئے گا۔ درحقیقت بیدل کے پچھلی صدی میں گم ہو جانے کی بھی ایک خاص وجہ یہی ہے کہ وہ ڈرائیڈن پوپ اور جانسن کے نظریات کے مطابق شاعری نہیں کرتا تھا جن کی پیروی سے اردو تنقید کی ابتدا ہوئی ہے۔ شبلی اگرچہ حالی کی طرح متاثر مغربی نہ تھے تاہم تھے تو اسی عہد کے آدمی اور اسی اثر کے تحت انھوں نے بیدل کو شعر العجم سے خارج کر دیا اور اپنے ستم کا نشانہ بنایا۔ شبلی نے بیدل کے ساتھ وہی کیا جو آگسٹن اسکول کے ڈکٹیٹر جانسن نے مغموم اور کم سخن شاعر گرے کے ساتھ کیا تھا لیکن گرے کی آواز جانسن اور اس کی پوری تنقیدی حاکمیت کے وجود سے بھی نہ دب سکی اور رومانی تحریک کی شکل میں انگریزی شاعری پر چھا گئی۔ بیدل کی آواز بھی تقریباً دو سو برس زیرِ زمین سفر کرنے کے بعد اردو شاعری کے نئے لہجہ میں دوبارہ ابھری ہے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو یہ احساس ہو کہ جدید غزل گو کو بیدل سے کیا واسطہ ان میں شاید ہی کسی نے اس کے کلام کو پڑھا بھی نہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے شاعری کا تعلق عقل و فہم کی خارجی سطح سے اتر کر انسانی جبلت اور قوم کے اجتماعی لاشعور تک پہنچ جاتا ہے اردو شاعری کا نیا رجحان اسی لاشعور یا تحت الشعور سے متعلق ہے جس کی گرفت میں بیدل تو نسبتاً حال کا شاعر تھا میرا بائی فیضی کبیر خسرو اور کالیداس بھی آ سکتے ہیں۔

---

[1] آزاد ترجمہ CREATIVE ENCOUNTER مطبوعہ لندن ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۴۔

سخاوت مرزا

حیدرآباد کا ایک مشاعرہ

رسالہ تاج ماہنامہ، حیدرآباد دکن میں بزم مشاعرہ کے نام سے ایک روداد "روح ادب" شائع ہوا کرتی تھی یہ مشاعرے اکثر میر کاظم علی باغ جدامجد نظر حیدرآبادی کے مکان پر ہوا کرتے تھے جس میں حیدرآباد کے علاوہ اور شمالی ہند کے مشہور شعراء، متوطن حیدرآباد بھی شریک ہوتے تھے۔ جن میں حکیم آزاد انصاری، برتر غازی پوری، جوش ملیح آبادی، مولانا سلیم پانی پتی، ضامن کنتوری، نظم طباطبائی، مرزا ہادی رسوا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ روداد میں زیادہ تر شعراء کے نام اور تخلص ہوتا ہے، اگر ہم یہاں ان کا سنہ وفات یا اور کچھ حالات کا مختصر اشارہ کردیں تو غالباً بہتر ہوگا۔ رودادوں میں حروف تہجی کے لحاظ سے شعراء کے نام آتے ہیں جس کا التزام ہم نے رکھا ہے۔

اختر، علی اختر، پدر بزرگوار نظر حیدرآبادی مرحوم جو پاکستان آگئے تھے اور یہیں انتقال ہوا اخبار جنگ کراچی میں ان کی تعزیہ اور کلام مع حالات شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے محتاج تعارف نہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ادبیات اردو حیدرآباد سے شائع ہوچکا ہے۔ غرض اختر کی غزل کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

پھر مری دنیائے غم آشوب تنہائی ہوئی — نذر احساس تپش تاب شکیبائی ہوئی
چھیڑنے کی دیر ہے پھر جوش میں آ خون دل — نوک مژگاں تک ہے موج اشک آئی ہوئی
آج مقصود نظر ہے پھر کوئی گیسو بدوش — مطلع دل پر ہے اک کالی گھٹا چھائی ہوئی
پھر نغانے دل میں ہے تو تبسم حسن شوخ — برق پھرتی ہے مرے خرمن پہ لہرائی ہوئی
منتظر ہے پھر کسی کے در پہ سجدہ دل کے لئے — اک جبین شوق سو سو بار ٹھکرائی ہوئی

حکیم آزاد انصاری۔ ان کا مجموعہ کلام معارف جمیل مطبوعہ ہے اگست و ستمبر سنہ ۱۹۲۸ء کے مشاعروں کا کلام ہے۔ مدتوں حیدرآباد میں رہے ایک اخبار نامہ ذیر گزٹ نکالتے تھے۔ اس میں ایک مضمون رشوت ستانی پر کسی کا "ملازمت کا سہاگ" کے نام سے اور ایک نظم سفارش، اظہر کی شائع ہوئی تھی، نیز امیدواران ملازمت کے انتخاب کا انٹرویو میری نظر سے گزرا تھا۔

جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

یہ وہ مقتل ہے جس کو لوگ انٹرویو کہتے ہیں — سفارش کے تبر سے جس کی گردن کاٹی جاتی ہے

غرض آزاد کے غزل کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

حیف اے اظہار حرف شوق کے اقدام ایف — وہ نظر جیسی ہوئی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
اب کہاں وہ سوز الفت اب کہاں وہ آرزو — ایک چنگاری سی ہے اور وہ بھی بجھائی ہوئی
اک تجلی آزاد اپنے دل کی دل میں لے چلے — ورنہ اس محفل میں دنیا کی شنوائی ہوئی

الم، ڈاکٹر سید مہدی حسن رضوی، تلمیذ داغ دہلوی (سخنوران دکن) ؎

جب کی ہے میں نے توبہ گھٹا ہوں رات دن — آسماں پر رہتی ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

برتر، نادر علی غازی پوری، معاصر داغ و امیر کمینی وجلیل، و ترکی ملازم جاگیر راجہ رائے رایاں۔

(سخنوران دکن ملاحظہ ہو) ؎

حسن کی روز ازل جب جلوہ فرمائی ہوئی — عشق آئینہ بنا خلقت تماشائی ہوئی
شورشیں یکساں تھیں حسن و عشق دونوں کی مگر — آپ کی شہرت ہوئی عاشق کی رسوائی ہوئی
ہے یہ اے برتر جناب باغ کے دم کی بہار — یوں شگفتہ ہو گئیں کلیاں جو مرجھائی ہوئی

باغ، سید کاظم علی، تلمیذ داغ دہلوی ؎

یوں مسلط سایۂ مژگاں ہے چشم ناز پر — جیسے میخانے پہ ہو کالی گھٹا چھائی ہوئی
داغ افسردہ ہمارے دل میں یوں لے دے رہے — جیسے شاخ گل پہ کچھ کلیاں ہوں مرجھائی ہوئی

حضرت جوش ملیح آبادی، محتاج تعارف نہیں افکار جوش نمبر کراچی ملاحظہ ہو۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ کی اس روداد میں دو لاجواب غزلیں شامل ہیں، بڑے خوش خلق اور ملنسار، بذلہ سنج شخص ہیں۔ بڑے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ مجھ سے ایک دفعہ بیان فرمایا تھا کہ ان کا ننھیال تعلق اکبرآباد سے تھا۔ الفاظ سازی، محاورہ بندی، حسن ادا، جدت آفرینی کے بادشاہ ہیں۔ آپ کی دو غزلیں بجنسہ بطور یادگار نقل کی جاتی ہیں ؎

دل میں رفتہ رفتہ ایسی بزم آرائی ہوئی — محفل ہستی میری آنکھوں میں تنہائی ہوئی
اس کے شانے کو ہلایا اس کی زلفیں چوم لیں — کیا صبا پھرتی ہے وقت صبح اترائی ہوئی
وعدۂ دیدار کو دے تازہ قسموں سے فروغ — اس قسم کھانے سے کیا حاصل جو ہو کھائی ہوئی
ایسے دل کو درد پر ترجیح ہو جاتا رہے — وہ طبیعت جان پیاری جو ہو... ہوئی

سعادت نظیر

حیدرآباد

حیدرآباد، ہند کا دل ہے — آرزوؤں کی ایک محفل ہے
شہر ہے منچلے جوانوں کا — زندگانی کے پاسبانوں کا
کسی شاعر کے شعر کی تفسیر — کسی عاشق کے خواب کی تعبیر
گل ارض دکن کا کیا کہنا! — مخزن فکر و فن کا کیا کہنا!
تشنگان کمال آتے ہیں — پیاس اپنی بجھا کے جاتے ہیں
اس کو تہذیب کا جہاں کہئے — علم و عرفاں کا آسماں کہئے
اک مقام تجلیات ہے یہ — یا محبت کی کائنات ہے یہ
اس قدر دیدہ زیب اتنا حسین! — سارے عالم میں ایسا شہر نہیں
کتنی پر کیف ہے یہاں کی ہوا! — شعر و نغمات کی لطیف فضا
گوشہ گوشہ ہے دامن گلچیں — آسماں کی نظر لگے نہ کہیں
ذرہ ذرہ ہے دلکشی میں فرد — جس سے آگے ہیں ماہ و انجم گرد
دیدنی ہیں یہاں کے نقش و نگار — جیسے فنکار کے ہنر کی بہار
حسن رنگیں سے دل ربا شہکار — ذوق تعمیر کے حسین آثار

کتنی پرکار کتنی سادہ ہے!
کیوں نہ ہو یہ ہماری دنیا ہے

جلوہ آرا ہوں تجھ سے نہ تک کہیں بچھڑ کر
وہ جبیں جو ہو کسی کافر کی ٹھکرائی ہوئی

سامنے جب تجھ کو آنا ہی نہ تھا تو پھر بتا
کس نظارہ پر حسرت آنکھوں کو دکھائی ہوئی

مرحلے دلبری کا آئینہ بھی تنظر
سارے عشووں کا خلاصہ آنکھ شرمائی ہوئی

آگیا مجھ کو کہاں شادمانی کا خیال
پھر گئی اپنے قدم لب پر ہنسی آئی ہوئی

… غزل ... خمیرۂ بہار از جوش ملیح آبادی ؎

پھر طبیعت جوش کی ہے جوش پر آئی ہوئی
پھر گھنے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

جھکیں باغوں میں ہیں جامن کی ڈالیاں
جن پہ سر سے پاؤں تک ہے دوشیزگی چھائی ہوئی

پتیاں جن کی ہوئی ہیں دم سما ہی نہیں
آرہی ہیں دور کی کھیتی سے گھبرائی ہوئی

لڑکیوں ... کے سادہ تمدن کی جھلک
عارضوں پر مستی کی سرخیاں چھائی ہوئی

دونوں ہاتھوں سے سنبھالے میں ...
ہاتھ انگڑائی کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی

کالے کالے گیسوؤں پر جامنوں کا رنگ ہے
اودی اودی جامنوں پر ہے گھٹا چھائی ہوئی

اور وہ دل کش ... کر کا جامنیں ... ذرہ سے
وہ جھجکتی کرتیں وہ چال اٹھلائی ہوئی

پتلے پتلے وہ لب جیسے دو نازک انگلیاں
وہ سیہ زلفیں بکھرے شانوں پہ بل کھائی ہوئی

وہ تکلف اٹھا جوانوں کی نظر سے بار بار
وہ نگاہیں شہر کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی

آہ یہ کہ دوستانہ ہو جوش میں دیکھے نہیں
اکثر ای جوش ان فضلوں میں رسوائی ہوئی

حضرت جوش ملیح آبادی کی یہ غزل آج سے کوئی تقریباً پینتیس سال قبل کی ہے، جبکہ موصوف حیدرآباد دکن میں ناظر ادبی تھے۔ جامن والی کا سراپا خوب کھینچا ہے۔

سفیر، شائق حسین (ڈیجر فوج باقاعدہ سرکار نظام) ؎

بار بار اے حضرت ناصح ہے ذکر حق حق
پیر و مرشد کی طبیعت ہے کہیں آئی ہوئی

گھستی ہے میخانے کی چھت پر ہو رند شراب
چوٹیوں پر کہساروں کی گھٹا چھائی ہوئی

مسرور، محمد عظمت اللہ (تلمیذ داغ و جلیل مانکپوری) نوجوان فوت ۱۳۴۴ فصلی۔ دیوان مسرور، ثمالہ مسرور دو مجموعے یادگار چھوڑے) ؎

خواب میں جلوہ کسی کا دیکھتے ہی جاگ اٹھا
کھو گئی یوں دولت بیدار ہاتھ آئی ہوئی

پردہ رکھنا تھا ہمارے قتل کا منظور کو
چھپ گئی ہے دامن قاتل میں شرمائی ہوئی

شاکر (شاکر علی) فرزند برز ؎

زلف شبگوں کہتی ہے عارض پہ بل کھائی ہوئی
دیکھنا شام و سحر کی آج یکجائی ہوئی

سلیم، قادر محی الدین ؎

غم پہ غم صدمے پہ صدمے چلے بیٹھے ہی تم
اب کہیں ٹالے سے ٹل سکتی ہے قضا آئی ہوئی

جوہر، معشوق علی خاں دہلوی (تلمیذ غالب) ؎

دہر میں شہرت فزا جب اس کی یکتائی ہوئی
موسیٰ دکا فریں کیا ہنگامہ آرائی ہوئی

آج کل کے سب حسینوں پر ہو تم چھائے ہوئے
اور ادا تم پہ ہے سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

جوہر حیدرآباد دکن آگئے تھے اور ضلع بیدر میں مقیم تھے۔ اعجاز بیدری اور خیالی بیجاپوری معاصر تھے نعت گوئی میں بھی خاص مہارت تھی جامع مسجد بیدر میں وعظ بھی کیا کرتے تھے (مضمون عظمت اللہ بیگ رسالہ نقش)۔

سلیم پانی پتی (استاد جامعہ عثمانیہ) ؎

شوکت جم ہے میرے ہاتھوں کی دعائی ہوئی
دولت قارون ہے ان قدموں کی ٹھکرائی ہوئی

حسن کی جو بیلیاں بھرتی ہیں اترائی ہوئی
تیرے جلوے سے نظر آتی ہیں دھندلائی ہوئی

بیخودی شبنم ہوئی ہستی فنا میری مگر
کیا یہ کچھ کم ہے کہ سورج سے شناسائی ہوئی

میں نے دیکھا قابل زیبا الفت کے نقاش ازل
سایہ میں ہر شے تیری ہے جھلکائی ہوئی

ٹوٹ کر گرنے لگے جلووں پہ جو غیب سے
جب نظر آئیں نگاہیں میری للچائی ہوئی

اے تعصب تجھ نہ ہو تو جائیں مستجاب نفرتیں
یہ حرمیں یہ دور تک ہیں تیری ہی پھیلائی ہوئی

کوئی روزن ہو تو داخل اس میں ہو نور جہاں
ہیں در و دیوار دل پر ظلمتیں چھائی ہوئی

کاش دنیا آئے کوئی ان کو کوئے یار میں
آرزوؤں کی پڑی لاشیں ہیں کفنائی ہوئی

خانۂ دل میں اگر ہے جب تک دلبری
ہیں اداؤں کی تصویریں سی سجائی ہوئی

اک نگاہ عشوہ پرور تھی تری جس کے سبب
دل کی دنیا میں یہ سب ہنگامہ آرائی ہوئی

مولانا سلیم پانی پتی (متوفی ۱۹۲۸ء) جامعہ عثمانیہ کے بزم ...ین کے شمع فروزاں، بڑے بذلہ سنج، دیوان غالب بی اے کے طلبہ کو پڑھاتے تھے جن میں راقم بھی شریک تھا۔ اشعار غالب کی تشریح و توضیح میں بال کی کھال نکالتے تھے اور نفسیات غالب پر زور دیتے تھے مثلاً

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھ کو حریص لذت آزار دیکھ کر

جناب سلیم کی خوش مزاجی کلاس میں ایک قہقہہ برپا کر دیا کرتی تھی، البتہ ان کا مزاج ذرا ادب سے تجاوز کر جاتا تھا ایک شعر میں نت نت جم جم کا لفظ آگیا اس کے معنی تو اچھی طرح سمجھا دئے، آخر میں فرمایا کہ ہمارے پانی پت میں ایک خاکروب تھا میاں بیوی کی خاص وجہ سے نبھتی نہ تھی، ایک دن لڑائی ٹھن گئی اور میاں نے گالیاں بے نقط سنائیں تو مہترانی جوش میں یہ کہہ رہی تھی "نت نت جم جم" نت نت جم جم۔

ہماری ایک انجمن تھی تنظیم المسلمین جہاں ہفتہ وار تقریریں اور مباحثے نیز ماہانہ مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے جس کے بانی میرے ایک دوست شیخ احمد شرر مرحوم تھے ایک جلسہ میں نظیر حسن المتخلص بہ سخا دہلوی کی شعر و شاعری پر تقریر کی اور آج کل کی شاعری پر بھی اعتراض کئے ہمارے ایک دوست شاہ اللہ شریف کو تاؤ آگیا دوسرے جلسہ میں جناب سلیم صاحب کو مدعو کیا گیا، سلیم صاحب نے فرمایا کہ شاعری محض دندان تو در دہان نہیں ہے نیز زبان اور صوتیات پر عالمانہ تقریر فرمائی استاذی سلیم صاحب نے ایک دفعہ ریاضی کے طلبہ سے فرمایا کیا خشک مضمون لے رکھا ہے، چلو باغ کی سیر کرو اچھلو کودو گاؤ اور اپنا دل بہلاؤ۔ غرض عجیب و غریب شخص تھے بذلہ سنج اور اپنے فن کے بڑے ماہر تھے

ضامن کنتوری، سید محمد ضامن (خلف حبیب کنتوری) ؎

کیا گھٹا جنت کی ہے میخانے پر چھائی ہوئی
آج کچھ زاہد کی بھی نیت ہے للچائی ہوئی

کیا کروں دل میں اگر نہیں چلتی ہے جبر سے نگاہ
یہ بھی دل کی گرہ ہے تیری پرکائی ہوئی

کیوں نہ ہو نے مرحبا کیا خوب لچکی ہے کمند
شوق کی گردن میں پھندا تیری انگڑائی ہوئی

بات تھا صاحب کی ہے خاطر ورنہ کیا کہتے غزل
ہم شگفتہ خاک ضامن طبع مرجھائی ہوئی

ضامن مدیر رسالہ استعارہ بریلی، دبستان الملک حیدرآباد دکن (۱۲۸۷ھ ولادت کنتور ۱۹۲۳ء) ایک مشاعرہ میں میں نے بھی ان کی ایک غزل سنی تھی، کلام بامحاورہ ہوتا تھا، نواب عماد الملک سید

حسین بلگرامی سے بھی ان کے تعلقات تھے انگلستان سے نواب صاحب نے ان کے والد کو خط لکھا تو ضامن کے متعلق بھی دریافت کیا کہ ضامن کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں" تو ضامن ان الفاظ سے بہت متاثر ہوئے (مکتوبات عماد الملک)

بلیغ ، سید کاظم علی تلمیذ داغ دہلوی ؎

جب وہ اٹھ کر چلا شب خصت شکیبائی ہوئی
کیا کہوں پھر کیا ہوا جب رخصت تنہائی ہوئی

اس نے میں کر رہا ہوں وعدہ فردا کا ذکر
یاد آ جائے نہیں جھوٹی قسم کھائی ہوئی

یوں مسلط سایۂ مژگاں ہے چشم ناز پر
جیسے میخانے پہ ہو کالی گھٹا چھائی ہوئی

داغ افسردہ ہمارے دل میں یوں ہیں باغ میں
جیسے شاخ گل پہ کچھ کلیاں ہوں مرجھائی ہوئی

باغ ، ابن جعفر علی سبزواری جد امجد نظر حیدر آبادی مرحوم، باغ تخلص مرزا آغا اسحٰق طبیب نثار یار جنگ کے عزیز تھے، نواب صاحب کے مکان پر بھی اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے شعرا میں ایک مزاحیہ شاعر مولوی اسحٰق المتخلص بہ چچا مرزا لبیب تیموری بھی شریک رہا کرتے تھے عجیب پر لطف صحبت رہا کرتی تھی۔ چچا نے غزل پڑھی تھی جس کا مقطع یہ تھا ؎

یہ جواب اس عمر میں تو کیا غم اے چچا
عشق بازی میں تو غیر مبتلے ناقص آئے

باغ صاحب نے انجمن تعلیم ملین کے مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے جس پر داد دی گئی تھی ؎

ٹرکے وہ تو ساکن ہوئیں گردشیں
چلے وہ تو محشر بپا ہو گیا

اسی مشاعرہ میں محمود خاں محمود ، ایک مطلع پڑھتے ؎

حیرانی کا آنا بلا ہو گیا
مزاج آپ کا کیا سے کیا ہو گیا

نظم طباطبائی ، (حیدر یار جنگ) محتاج تعارف نہیں ؎

صبح پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
سکرات ہے سر پہ لیں اجل آئی ہوئی

منہ سے نکلی بات اور طوفاں پر طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی ہی رسوائی ہوئی

بگڑی طبیعت نہیں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی

کھل گئے گل عقدۂ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخن موج صبا سے بھی نہ گرائی ہوئی

اک قدم ہے اندرون خانہ اک بیرون در
سانس ہے تالب یہی جو آئی بھی تو آئی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم شمل قلم
مدتوں سجدے کئے برسوں جبیں سائی ہوئی

جھکتی ایسی خانقہ میں حضرت زاہد کی ہیں
ہو یقیں آتی ہی ہو گی سجدے میں جھکائی ہوئی

آپ کا دیوان صوت الشعرا چھپ چکا ہے۔ ایک مضمون "سبعہ سیارہ" (مجمع شعراء باکمال) رسالہ مجلہ عثمانیہ میں نظر سے گزرا تھا

غیاں ، حکیم میر شاہ حسن علی حیدر آبادی ؎

دل میں یاد غیر نے میں چٹکیاں جب بزم میں
رکھ لی چپ ہونٹوں پہ ان کے ہنسی آئی ہوئی

واصفی ، عبد الصمد خاں (تلمیذ داغ) ؎

جا بجا حسرت ٹپکتی ہے در و دیوار پر
کس کی چشم ترکی یہ بوندیں ہیں برسائی ہوئی

کیا قیامت ہے ہمارے دل کو کر کے پائمال
پوچھتے ہیں وہ یہ شے ہے کس کی ٹھکرائی ہوئی

دشت میں تر کر دیا ہر اک زبان خار کو
کام کی نکلیں ہماری آبلہ پائی ہوئی

دیکھے جاتے ہیں وہ چھپ چھپ کے سیر اجالی زار
آنکھ جن ان کی چڑھی ہے تو شرمائی ہوئی

یٰسین ، غلام یٰسین خاں (جمعدار نظم جمعیت ولادت ۱۳۰۱ھ)

خواب حسن ازل جب کہ خود آرائی ہوئی
خود تماشا بن کے آئی خود تماشائی ہوئی

دست وہ اماں تیغ قاتل سبب سرا پکنج
کیا خطا تھا خون ناحق رنگ ہے لائی ہوئی

گلشن عالم میں پھولے کر برا نخل مراد
اک کلی نکلی کی تازہ ایک مرجھائی ہوئی

عابد ، حکیم سید عابد (متوفی ۱۳۲۷ھ) مہتمم شفا خانہ یونانی ؎

بیکر تمنی محفل میں ان کی آنکھ شرمائی ہوئی
رہ گئی برق نگہ پلکوں میں الجھائی ہوئی

عزیز ، عبد القادر احمد ؎

وہ جنازے پر مرے آئے مگر پوچھتے نا تھے
روح مصعقے ہو رہی ہے ان پہ للچائی ہوئی

محمود ، حاجی محمود خاں ؎

ہوش میں رہتے اگر موسیٰ تو ہوتی کچھ خبر
برق تجلی طور پر یا جلوہ فرمائی ہوئی

مرزا محمد ہادی رسوا ؎

کیا بلی لگتی ہے زلف یار بل کھائی ہوئی
چاند سے رخسار پر بکھری ہوئی چھائی ہوئی

ان سے کیا زینت تری اے چرخ مینائی ہوئی
چاہیے صورت حسینوں کا ستاروں کے عوض

بندہ پرور طور پر کیوں جلوہ فرمائی ہوئی
عرش پر وحشت ذکی یاد ان کی گنجائش ہی تھی

جب طبیعت ہو کسی معشوق پر آئی ہوئی
کیا بری لگتی ہے ارباب غرض کی رنگ روک

رک نہیں سکتی طبیعت تیری گرمائی ہوئی
ہم ہیں اے مرزا غزل ہے یہ کہ اک طومار ہے

مرزا رسوا محتاج تعارف نہیں امراؤ جان ادا ان کی مشہور تصنیف ہے اور کراچی میں کئی سال قبل ایک فلم بھی اس ناول پر ہو چکا ہے۔ (رسالہ تاج حیدر آباد دکن جلد ۱ شمارہ ۱۱ ص ۲۲)

شیو راج بہار

غزل

ہر الم باعث مسرت ہے
کیا غم دوست کی کرامت ہے

جب بھی کوئی ہنسا تو ہم روئے
تیرے غم کی عجیب فطرت ہے

بزم رنداں میں آ کے دیکھ اے شیخ!
زندگی کتنی پر مسرت ہے

نام رہتا ہے تیرا ورد زباں
تیرا غم ہی تری عبادت ہے

تجھکو دیکھا تھا کس لئے میں نے
اب یہ خود سے مجھے شکایت ہے

آہ، کیا جانے وہ بت کافر
بت پرستی بشر کی فطرت ہے

عشوہ و غمزہ ہو کہ ناز بہار!
ان کی اک اک ادا قیامت ہے

جواہر لال نہرو

مہاتما گاندھی کی نظر میں

پنڈت جواہر لال ہر طرح سے قابل ہیں انھوں نے برسوں تک بے مثال قابلیت سے اور عقیدت کے ساتھ کانگرس کے سکریٹری کا کام کیا ہے۔ اپنی بہادری، پختہ ارادے، عقیدت، سادگی، سچائی اور تحمل کی وجہ سے انھوں نے دیش کے نوجوانوں کا من مٹھی میں کر لیا ہے وہ کسانوں اور مزدوروں کے بھی تعلق میں آئے ہیں۔ یورپ کی سیاست کا جو دقیق مطالعہ انھیں ہے اس سے انھیں اپنے دیش کی سیاست کو سمجھنے اور اس کی تعمیر میں مدد ملے گی۔

جنھیں یہ پتہ ہے کہ جواہر لال کا اور میرا کیا تعلق ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کانگرس کے سبھاپتی ہوئے تو کیا اور میں ہوا تو کیا! خیال یا دماغ کے لحاظ سے ہم میں اختلاف بھلے ہی ہو ہمارے دل تو ایک ہیں دوسرے نوجوانی کے لائق تیزی کے رہتے ہوئے بھی اپنے کڑے ڈسپلن اور عقیدت جیسے اوصاف کی وجہ سے وہ ایک یکتا دوست ہیں، جن پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

..... جہاں ان میں ایک بہادر جنگجو آدمی کی طرح حوصلہ دلیری اور تیزی ہے، وہاں ایک مدبر کی سی سمجھداری اور دور اندیشی بھی ہے ڈسپلن کے وہ پورے بھگت ہیں اور ایسے وقت میں بھی جبکہ ڈسپلن میں رہنا بے عزتی سی معلوم ہوتی تھی، انھوں نے اس پابندی سے عمل کر کے دکھایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے آس پاس والوں کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ انتہا پسند اور گرم دل کے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ حلیم اور حالِ تجربہ کار اتنے ہیں کہ کسی بات پر اتنا زور نہیں دیتے کہ وہ نامنظور ہو جائے۔ جواہر لال گوہر آب کی طرح شفاف اور پاک ہیں ان کی سچائی سے متعلق تو شک کی گنجائش ہی نہیں۔ وہ ایک نڈر اور بغیر کسی کلنک کے معصوم سردار ہیں۔ قوم ان کے ہاتھوں میں محفوظ ہے

..... بھارت میں نوجوانوں کی کمی نہیں ہے، لیکن جواہر لال کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے کسی نوجوان کو میں نہیں جانتا۔ اتنا میرے دل میں ان کے لئے پیار ہے یا کہئے کہ موہ ہے لیکن یہ پریم یا موہ ان کی شکتی کے مطابق قائم ہے اور اس لئے میں کہتا ہوں کہ جب تک ان کے ہاتھ میں لگام ہے، ہم اپنی مطلوبہ چیز حاصل کر لیں تو کتنا اچھا ہو! . . . .

جواہر لال ہند کا جواہر ثابت ہوا ہے۔ ان کی تقریروں میں نہایت اونچے خیال، منطقی اور شائستہ زبان میں ظاہر ہوئے ہیں کئی باتوں کے متعلق یہ تقریر ہوئی پھر بھی دلچسپ ہے۔ مدح کی جھلک ہر ایک جملے سے جھلکتی ہے کئی لوگوں کے دلوں میں جو ڈر تھا، تقریر کے بعد وہ سب مٹ گیا جیسی ان کی تقریر تھی، ویسا ہی ان کا عمل بھی تھا کانگرس کے دنوں میں انھوں نے اپنا سارا کام آزادی اور مکمل انصاف پسندی سے کیا اور اپنا کام لگن سے کرتے رہنے کی وجہ سے سب کچھ ٹھیک وقت پر بغیر رکاوٹ کے مکمل ہوا۔

ایسے جانباز اور پاک نوجوان کی صدارت میں اگر ہم کچھ نہ کر پائیں گے تو مجھے بڑا تعجب ہو گا۔ لیکن اگر فوج ہی نالائق ہو تو جانباز لیڈر بھی کیا کر سکتا ہے؟ اس لئے ہمیں اپنا نفسیاتی جائزہ لینا چاہیئے کیا ہم جواہر لال کی قیادت کے لائق ہیں؟ اگر ہیں تو نتیجے نیک ہی نکلیں گے۔

..... پنڈت نہرو نے اپنے مادر وطن اور اس کے چرنوں میں اپنی زندگی کی سبھی خواہشیں اور ارمان بھینٹ کر دی ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی دوسرے دیس کی امداد سے ملنے والی اپنے دیس کی آزادی کو بھی باعزت آزادی نہیں سمجھا۔

... ہمیں الگ کرنے کے لئے صرف تفرقات کافی نہیں ہیں۔ ہم جس لمحے آپس میں مل کر کام کرنے لگے ہیں، تبھی سے ہمارے بیچ میں تفرقہ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی میں کئی سال سے کہتا رہا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ جواہر لال میرا جانشین ہو گا..... وہ کہتا ہے کہ میری زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی.... وہ بھی کہتا ہے کہ اس کی زبان میرے لئے اجنبی ہے۔ یہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دلوں کی ایکتا میں زبان رکاوٹ نہیں ہوتی۔

اور میں جانتا ہوں کہ جب چلا جاؤں گا، جواہر لال میری ہی زبان میں بات کرے گا۔

... آپ کے اصلی بادشاہ جواہر لال ہیں۔ وہ ایسے بادشاہ ہیں جو ہندوستان کو تو اپنی خدمت دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے سبھی دیسوں کے لوگوں سے تعارف حاصل کر لیا ہے۔

جواہر تو کسی سے بھی دھوکہ کرنے والا نہیں ہے، جیسا ان کا نام ہے ویسا ان کا وصف۔

وہ آسانی سے باپ بھائی، مصنف، راہی، دیش بھگت یا بین الاقوامی لیڈر کی صورت میں مشہور ہیں۔ تو بھی قارئین کے سامنے ان مضامین میں سے ان کا جو روپ نکھرے گا وہ اپنے دیس اور اس کی آزادی کے اس کے پاؤں میں انھوں نے دوسری سبھی خواہشیں بھینٹ کر دی ہیں، عقیدت مند بھگت کا روپ ہو گا یہ سہرا انھیں کے سر بندھنا چاہئے کہ وہ کسی غیر ملک کی امداد کی قیمت پر اپنے دیس کی آزادی حاصل کرنا شان کے خلاف سمجھیں گے ان کی قومیت بین الاقوامیت جیسی ہے۔

(خبرنامہ اردو شعبہ گاندھی پیدائش صدی سے ماخوذ)

پتہ دیکھئے اگر آپ کے پتہ کے اوپر سرخ نشان ہے تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ مدت اشاعت کے بعد آپ کی میعاد خریداری ختم ہو جائے گی مہربانی فرما کر ہماری زبان کی سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپے منی آرڈر سے بھیجئے۔

مراسلات

اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس اور مہاراشٹر کے اردو اساتذہ

انجمن اساتذۂ اردو کی تیسری کانفرنس میں شرکت کے لئے مختلف یونی ورسٹیوں نے اپنے جو نمائندے نامزد کئے تھے ان کی تفصیل فہرست ۲۲ر اکتوبر کے "ہماری زبان" میں میری نظر سے گزری تھی۔ اس فہرست میں بمبئی یونیورسٹی کے کسی نمائندے کا نام نہ دیکھ کر مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی مگر میں اس خوش فہمی میں تھا کہ بمبئی یونی ورسٹی اور اس سے ملحقہ کالجوں کے اہم اردو اساتذہ کم از کم اپنے طور پر تو اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں گے۔ مگر یکم نومبر کے تازہ "ہماری زبان" میں کانفرنس کی مفصل رپورٹ پڑھ کر مجھے ایک طرف خوشی ہوئی ہے تو دوسری طرف اس بات کا انتہائی ملال بھی ہو رہا ہے کہ کانفرنس کے شرکا میں اردو کے ان معروف اور اہم اساتذہ میں سے کسی کا بھی نام شامل نہیں ہے جو بمبئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے"

کانفرنس کی رپورٹ سے جو صورتِ حال اس وقت میرے سامنے ہے اس کی صرف دو وجوہات میری سمجھ میں آسکی ہیں (۱) یا تو کانفرنس کے منتظمین نے خود ہی بمبئی یونی ورسٹی کے اردو اساتذہ کی شرکت کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے یا پھر (۲) خود بمبئی یونی ورسٹی اور اس کے کالجوں کے اردو اساتذہ کو اپنی زبان کے تعلیمی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

بہرحال جہاں تک میری ناقص رائے کا تعلق ہے اگر یہ صحیح ہے کہ مہاراشٹر میں بھی اردو کی تعلیم و تدریس ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ ہمارے مسائل ان یونی ورسٹیوں اور ریاستوں کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں جن کے نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، تو نہ صرف بمبئی یونی ورسٹی بلکہ پونہ، ناگپور، اور شیواجی یونی ورسٹی کے بھی کچھ اردو اساتذہ کو اس میں اپنے طور پر شرکت کرنی چاہئے تھی۔

(بدیع الزماں خاور)

صد سالہ جشن غالب

حلقۂ ادب (رانچی)، غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک باتصویر خاص نمبر ترتیب دے رہا ہے۔ ہند و پاک کے اہل قلم سے مخلصانہ گزارش ہے کہ غالب سے متعلق گرانقدر نگارشات اپنی پاسپورٹ سائز تصویر کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ حلقۂ ادب خاص نمبر کے لئے منتخب تخلیقات پر قلمکاروں کو دلکش معاوضہ بھی پیش کرے گا۔ مضامین بذریعہ رجسٹری ارسال کئے جائیں۔

پتہ:- اسلم پرویز (معاون) ناظم اعلیٰ حلقۂ ادب۔ قبلہ نما، پراسولی، رانچی

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

معراج العاشقین کا مصنف

مصنف:- ڈاکٹر حفیظ قتیل — صفحات ۱۰۰

ملنے کا پتہ:- ڈاکٹر حفیظ قتیل حیرت کدہ سلطان پورہ حیدرآباد دکن

ہندوستان کی مسجدیں۔

مصنف:- ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

ناشر:- پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶ — صفحات:- ۴۸

قیمت:- دو روپے۔

یادگار مشاعرہ کے ساتھ حیدرآباد میں جشن غالب تقاریب کا آغاز

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش کے دارالخلافہ حیدرآباد میں اردو کے منفرد اور صاحب طرز شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں جشن غالب کی تقاریب کا "مشاعرہ غالب" سے آغاز ہوا۔ مسز جنتی دیوی ہال رام کوٹ میں منعقدہ اس تاریخی اور یادگار مشاعرہ میں پاکستان کے ممتاز ترقی پسند انقلابی شاعر فیض احمد فیض نے اپنی نظمیں، غزلیں اور قطعات سنائے۔ اس مشاعرہ کی صدارت وزیر اطلاعات جناب کونڈہ لکشمن باپوجی نے کی وزیر مواصلات و آبرسانی جناب جے وی نرسنگ راؤ نے جو جشن غالب صد سالہ کمیٹی کے صدر بھی ہیں اپنی خیر مقدمی تقریر میں غالب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ اور کہا کہ مرزا غالب نے اپنی شاعری کے ذریعہ نہ صرف ایک پوری نسل کو متاثر کیا بلکہ موجودہ اور آنے والی نسلوں میں بھی وہ ہمیشہ ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے۔ ہندوستان کو اس بات پر فخر ہے کہ یہ عظیم شاعر اسی ملک میں پیدا ہوا، اور وطن دوستی کی روایت قائم کی۔ جناب جے وی نرسنگ راؤ نے کہا کہ اردو شاعری کی زلف کو سنوارنے میں غالب ہی کا زیادہ حصہ رہا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو بام عروج پر پہنچایا۔ اور اس کے لئے فارسی زبان کو بھی استعمال کیا۔ ان کی شاعری میں ایک عام انسان کا دل دھڑکتا ہے۔ وزیر مواصلات نے فیض احمد فیض کو آج کے دور کا ایک عظیم شاعر قرار دیتے ہوئے خیر مقدم کیا اور کہا کہ فیض کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ ایک صحافی ایک دانشور اور ایک شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت کے حامل ہیں یہ بات اہل حیدرآباد کے لئے باعث مسرت ہے کہ فیض آج ہمارے درمیان ہیں انھوں نے فیض اور صدر مشاعرہ جناب کونڈہ لکشمن باپوجی کی گلپوشی کی جس کے بعد فیض احمد فیض نے صد سالہ جشن غالب کمیٹی آندھرا پردیش اور اہل حیدرآباد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھیں عرصہ دراز سے حیدرآباد آنے کی خواہش تھی وہ آج پوری ہوئی ہے اس کے بعد فیض احمد فیض نے یہ قطعہ سنایا ؎

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیماں بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر دل میں ہے محشر برپا
اور سکوں اتنا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اس کے بعد فیض نے رباعیاں، غزلیں اور نظم سنائی۔ اس کے بعد ممتاز غزل گو شاعر مخدوم محی الدین نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا ؎

چمن ہے منتظر نغمہ و ساز کیا کہئے
بس اک سکوت کا عالم جسے نوا کہئے

مخدوم محی الدین نے بھی اپنی دو غزلیں اور دو نظمیں سنائیں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ابتدا میں صد سالہ جشن غالب کمیٹی آندھرا پردیش کی جانب سے مہمانوں کا استقبال کیا اور مشاعرہ کی کارروائی کے آغاز کا اعلان کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے شہرۂ آفاق شاعر غالب کی صد سالہ جشن کی تقاریب کا اس مشاعرہ سے آغاز ہو رہا ہے۔ فروری ۱۹۶۹ء میں جشن غالب منایا جائے گا مشاعرہ میں صلاح الدین نیّر، فیض الحسن خیال، ناصر کرنولی، غالب زراقی، خورشید احمد جامی، حکیم یوسف حسین خاں، ابن احمد تاب، کنول پرشاد کنول، رئیس اختر، وقار خلیل، تاج مہجور، سرفراز علی مرزا، اوج یعقوبی، خیرات ندیم، شاذ تمکنت، پرنس لئیق علی خاں ثاقب، اور دوسرے شعرا نے کلام سنایا۔ خاتون شعراء میں محترمہ عظمت عبدالقیوم، ناز حیدر اور ثریا مہر نے اپنا کلام سنایا۔ مسز زینت ساجدہ کے شکریہ پر اس کامیاب محفل کا اختتام عمل میں آیا۔ (مرسلہ: پریس انفارمیشن بیورو صد سالہ جشن غالب کمیٹی)

سوویت یونین میں صد سالہ جشن غالب کی تیاریاں

حیدرآباد۔ سوویت یونین میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے صد سالہ جشن کے تعلق سے جو تیاریاں عمل میں آ رہی ہیں ان کا ایک خاکہ سوویت یونین میں غالب صد سالہ جشن کمیٹی کے صدر ڈاکٹر این گلیوف کے ایک پیام میں پیش کیا گیا ہے جو صد سالہ جشن غالب کمیٹی آندھرا پردیش کے صدر جناب دلدار حسین صاحب کے نام موصول ہوا ہے۔ ڈاکٹر این گلیوف نے اپنے پیام میں جشن صد سالہ غالب کی تقاریب کے سلسلے میں پُرجوش ممکنہ تعاون عمل کی پیشکش کی ہے۔ پیام میں بتلایا گیا ہے کہ جہاں تک سوویت یونین میں غالب کے صد سالہ جشن کا تعلق ہے اس کا پروگرام یہ ہے۔ آئندہ سال فروری میں ماسکو، ازبکستان اور تاجکستان میں سمپوزیم منعقد کئے جائیں گے۔ سمرقند میں آرٹس فیسٹیول منعقد ہوگا جس میں وسط ایشیاء کی سوویت جمہوریتیں حصہ لیں گی۔ اس فیسٹیول میں ہندوستان اور پاکستان کے فنکار بھی شرکت کریں گے۔ غالب کی منتخب غزلوں اور کلام کو روسی زبان میں شائع کیا جائے گا علاوہ ازیں غالب پر سوویت ادیبوں اور نقادوں کے مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کیا جائے گا۔ اس مجموعہ میں چند ہندوستانی ادیبوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ پیام کے آخر میں ان مضامین کی پیشکش بھی کی گئی ہے۔

(مرسلہ: پریس انفارمیشن بیورو)

گوالیار میں غالب صد سالہ کمیٹی کا انتخاب

غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کی مجلس عام کا ایک جلسہ جناب پی کے سری واستو کی صدارت میں چیمبر آف کامرس گوالیار میں منعقد ہوا۔ جس میں تقریبات کمیٹی کی مجلس عاملہ کے عہدہ داروں اور اراکین کا انتخاب عمل میں آیا اور اتفاق رائے سے مجلس عاملہ کے عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ (روزنامہ جادید)

سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار کی اپیل

پٹنہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب بیتاب صدیقی نے حسب ذیل اپیل اردو دوستوں کے نام بغرض اشاعت بھیجی ہے۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ممبر سازی کی مہم شروع ہو چکی ہے ضلعی شاخوں کے عہدیداروں کے پاس رسیدیں بھیجی جا چکی ہیں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا وفد تقریباً تمام اضلاع کے دورے ختم کر چکا ہے بعض اضلاع کی شاخیں ممبر سازی میں بے حد سرگرم ہیں ضرورت ہے کہ اردو کے بہی خواہ اور درد مند حضرات ممبر سازی کی مہم کی کامیابی کے لیے میدان عمل میں کود پڑیں ممبر سازی مفتہ مناتیں ہر فرد کو ممبر بنائیں۔ گھر گھر اردو کا پیغام پہنچائیں۔ انجمن نے کم سے کم دو لاکھ ابتدائی ممبر سازی کا اعلان کیا ہے اب یہ اردو دوستوں کے حوصلہ اور جوش و سرگرمی پر منحصر ہے کہ وہ اس نشانے کو عبور کرکے تین چار لاکھ رکن ممبر سازی کی تعداد پہنچائیں اور اس مہم کی کامیابی کے ذریعہ انجمن کی طاقت اور اس کا وقار بڑھائیں تاکہ انجمن تعمیری پروگرام اور تحفظ و بقا کی جد و جہد کو منزل تک پہنچا سکے۔ آخر میں بہار کے عام دردمندان اردو اور خصوصاً انجمن کی شاخوں کے ذمہ داروں سے اپیل ہے کہ وہ بد دلیوں کو خیر باد کہہ کر ممبر سازی کی مہم کو آگے بڑھانے کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں اور اپنی سرگرمی عمل سے ثابت کر دیں کہ اردو کا مفاد بہر حال انھیں عزیز ہے۔ (زمانہ نگار)

کانگریس پورے اردو کلچر کو بھی اپنائے

لکھنؤ۔ اردو ہمارے صوبے کی ہی زبان ہے اور اس کا کسی خاص مذہب اور ملت سے کوئی تعلق نہیں ہے اردو بولنے والے ہمارے صوبے میں بہت بڑی تعداد میں رہتے ہیں ان تک کانگریس کے پیغام کو ان کی زبان ہی میں پہنچانا بیحد ضروری ہو گیا ہے مذکورہ بالا الفاظ یوپی کانگریس کے صدر پنڈت کملاپتی ترپاٹھی نے گزشتہ شب یو۔پی کانگریس کے ہفت وار ہندی ترجمان "نیا بھارت" کے اردو ایڈیشن کے رسم اجراء کا افتتاح کرتے ہوئے کہے۔ اردو ایڈیشن کی رسم اجراء کی شاندار تقریب پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ کے موقعہ پر یو۔پی کانگریس کمیٹی کے دفتر نو قیصر باغ میں ہوئی۔ صدر یو۔پی کانگریس نے یو۔پی میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ اخبار کے اردو ایڈیشن کا اجراء اس قدر تاخیر سے جو ہو رہا ہے تو بے شک یہ ہماری بھول تھی لیکن یہ بھول صرف مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے ہوتی رہی۔" انھوں نے کہا کہ اردو ایسی زبان ہے جس کی اہمیت کو ہمارے ایسے لوگ ہمیشہ تسلیم کرتے رہے ہیں ہم اردو کو ہندی کا ہی ایک اسلوب سمجھتے ہیں اور دونوں کو ایک زبان سمجھتے ہوئے بنیادی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتے۔ یو۔پی کانگریس کے جنرل سکریٹری اور "نیا بھارت" کے مدیر اعلیٰ جناب ایچ۔ این بہوگنا نے اس سے قبل مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مدیر جناب آغا زیدی نے بھی حاضرین سے "نیا بھارت" اردو ایڈیشن سے تعاون کی اپیل کی۔ راجیہ سبھا کے کانگریس ممبر اور روزنامہ قومی آواز کے مدیر حیات اللہ انصاری نے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اردو نیا بھارت کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ۴۰ برس سے کانگریس کا خادم ہوں لیکن میرا خواب صرف اس اخبار کے نکلنے سے پورا نہیں ہوا اس وقت پورا ہوگا جب کانگریس اس پورے کلچر کی حفاظت اور اس سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرے گی جس کو اردو کا کلچر کہتے ہیں۔ اگر کانگریس نے یہ کام کیا تو میں اپنی اس زندگی کو جو کانگریس کی خدمت میں گزاری کامران سمجھوں گا۔ آخر میں نیا بھارت کے ذمہ دار جناب بنسی دھر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کا اختتام بزم مشاعرہ پر ہوا جس میں شہر کے ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔ (قومی آواز)

ضلع بلڈانہ مہاراشٹر میں اردو کالج کی ضرورت

بلڈانہ ضلع میں اردو کے ۸ ہائی اسکول ہیں دسویں میں ۲۵۰ ہائی اسکول ہیں مگر کالج نہ ہونے کی وجہ سے اردو داں طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔ ضلع انجمن ترقی اردو ہند ملکاپور کی کوششوں سے گزشتہ دو سال کے عرصہ میں ۴ ہائی اسکول، مڈل اسکول اور پرائمری اسکولوں کا اجراء عمل میں آچکا ہے۔ فی الحال بلڈانہ ضلع میں ۱۳۴ اردو پرائمری مدارس ہیں۔ ۷ ہائی اسکول ہیں ۲ ہائی اسکول سال رواں سے جاری ہوئے ہیں۔ ان تمام اردو مدارس میں ۲۳۶۴۲ طلبہ زیر تعلیم تھے ۷۰-۱۹۶۹ء میں بلڈانہ ضلع کی آبادی ۱۱ لاکھ کی ہے جس میں اردو آبادی ایک لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ دو ربع میں ۱۱ لاکھ اردو آبادی ہے لہٰذا یہاں کالج کی سخت ضرورت ہے جس پر تقریباً ۲ لاکھ روپیہ درکار ہے۔ (حمید اشرف خاں)

وزیر تعلیم راجستھان کو انجمن شاخ راجستھان کا میمورنڈم

انجمن ترقی اردو راجستھان نے وزیر تعلیم راجستھان کی خدمت میں دو میمورنڈم بھیجے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے ایک میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ انجمن ترقی اردو راجستھان یہ بات شدت سے محسوس کر رہی ہے کہ محکمہ تعلیم راجستھان کے افسران گورنمنٹ کی پالیسیوں کو بروئے کار لانے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس رویہ کی بنا پر اردو بولنے والے لوگوں کو دقتیں پیش آرہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس شکایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ نے ایک سرکولر کے ذریعہ یہ واضح کر دیا تھا کہ جس کلاس میں دس طلبہ یا کسی اسکول میں ۴۰ طلبہ ہوں جو اپنی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو انھیں اردو پڑھنے کی سہولتیں دی جائیں گی اس طرح کے سرکولر ایڈیشنل ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نے صوبہ کے سارے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں بھیجے چنانچہ اس سرکولر پر گورنمنٹ پرائمری اسکول محلہ مہاوتان تو پخانہ حضوری جے پور میں بھی عمل درآمد ہوا چنانچہ اس اسکول میں گزشتہ سیشن تک اردو کی تعلیم

ہوتی تھی لیکن اس سال وہاں کے ہیڈ ماسٹر نے بغیر کسی حکم کے وہاں اردو کی تعلیم کو ختم کر دیا حالانکہ اب بھی وہاں معقول تعداد سے زیادہ اردو طلبہ موجود ہیں چنانچہ ہم اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اردو کو دوبارہ اسکول میں رائج کیا جائے۔ انجمن کی طرف سے ایک میمورنڈم وزیر تعلیم راجستھان کو بھی گیا ہے جس میں ان کی توجہ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی ایک نیم سرکاری ادارہ ہے جسے راجستھان گورنمنٹ، اردو ہندی اور سنسکرت کی ترقی کے لئے امداد بھی ملتی ہے اس کے باوجود راجستھان اکیڈمی کا رویہ اردو کی طرف اطمینان بخش نہیں ہے۔ (نامہ نگار)

لکھنؤ یونی ورسٹی تقریب غالب منائے گی

لکھنؤ۔ اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی نے پروگرام کے مطابق "غالب ہفتہ" کی تقریبات کا آغاز یونی ورسٹی ہال میں "غالب تصویری نمائش" سے کیا اس تقریب کی صدارت شعبۂ فارسی و اردو کے ریڈر ڈاکٹر سید رغیب حسین نے اور نمائش کا افتتاح لکھنؤ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایم۔بی لال نے کیا۔ مختلف نامور مصوروں کی بنائی ہوئی رنگ برنگی تصویریں یونین ہال میں سلیقے سے سجائی گئی تھیں تصاویر کے نیچے لکھے ہوئے غالب کے اشعار ان تصویروں کی معنویت میں اضافہ کر رہے تھے۔ تقریب کا آغاز غالب کی ایک غزل سے ہوا جسے یونی ورسٹی کے ایک طالب علم سلمان عباسی نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد سوسائٹی کے صدر سید ضیاء الحسن نے اپنی تقریر کے ذریعہ غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ صدر کی تقریر کے بعد شعبۂ اردو کے استاد جناب شبیہ الحسن صاحب نے آرٹ اور ادب کے موضوع پر تقریر کرکے غالب کے پورے کلام کو ایک آرٹ اور ایک سنجیدہ ادبی پیغام بتلایا۔ اس کے بعد سوسائٹی کے سکریٹری سید مصباح الاسلام نے سوسائٹی کی رپورٹ پیش کی اور کابینہ کے دوسرے ممبران کا تعارف مہمان خصوصی جناب وائس چانسلر صاحب سے کرایا۔ آخر میں جناب ڈاکٹر ایم بی لال صاحب وائس چانسلر یونی ورسٹی آف لکھنؤ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں تقریر کے ذریعہ غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ سب لوگوں کو یہ جان کر بہت خوشی ہوگی کہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں بھی یونی ورسٹی کی طرف سے بہت جلد غالب کی صد سالہ تقریبات منائی جائیں گی جن کے انتظامات شروع ہو چکے ہیں۔ ان تقریبات میں سے ایک مشاعرہ اور کوئی سیمینار بھی ہوگا۔" (قومی آواز)

نیپال میں غالب کی صد سالہ یاد میں مشاعرہ کا فیصلہ

لکھنؤ: جناب مقبول احمد لاری کی گولڈن جوبلی اور جناب رشی کیش شاہ ممبر راشٹریہ پنچایت نیپال و سابق وزیر خارجہ نیپال کے اعزاز کی تقاریب میں جناب عارف نیپالی صدر بزم ادب نیپال گنج نے شرکت کی انھوں نے اپنی نئی تصنیف نیپال کے اردو شاعروں کے منتخب مطبوعہ ادب پاروں کے مجموعہ "گلشن صد رنگ" کے بارے میں نیپال، لکھنؤ کے اہل قلم حضرات سے تبادلۂ خیال کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر کے صد سالہ برسی کے سلسلے میں نیپال گنج میں بھی ایک مشاعرہ کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے ابتدائی انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ (سیاست)

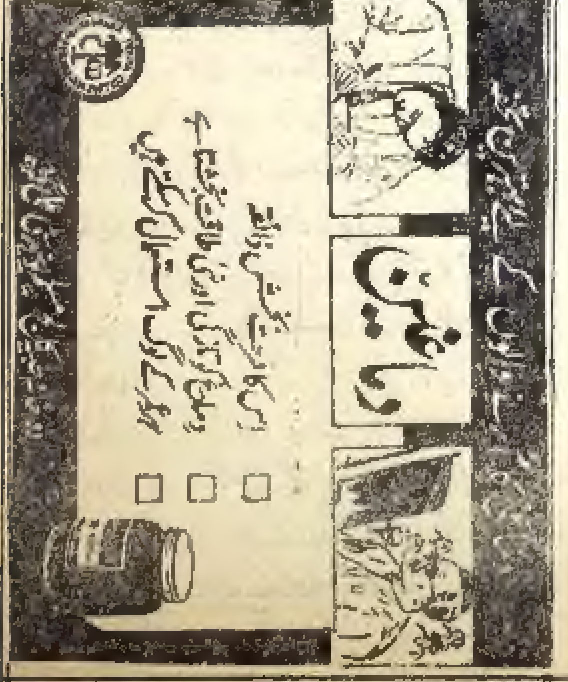
لکھنؤ کارپوریشن میں اردو کے مسئلہ پر واک آؤٹ

لکھنؤ۔ مقامی شہری کارپوریشن کے اجلاس میں نئو شائع شدہ بجٹ پر غور و خوض کے دوران جلسہ کی کاروائی کے آغاز میں ایک ممبر نے میئر سے دریافت کیا کہ آپ نے اردو زبان میں ایجنڈا اور ایوان کی کاروائی کی اشاعت کے بارے میں جو وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک کیوں پورا نہیں ہوا۔ اس پر میئر نے جو جواب دیا اسے ناکافی اور غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے مذکورہ ممبر نے احتجاجاً واک آؤٹ کر دیا۔ بعد میں ایک اور ممبر کے سوال پر میئر نے بتایا کہ میں اردو میں ایجنڈا اور ایوان کی کاروائی کی اشاعت کے مسئلہ پر بہ نظر ہمدردی غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (سیاست)

بمبئی میں جشن کرشن چندر

بمبئی۔ یہاں اردو کے ترقی پسند اہل قلم کرشن چندر کا جشن منایا گیا اس موقع پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جشن کرشن چندر کمیٹی کی جانب سے چاندی کا کشتی کرشن چندر کو پیش کی۔ زمانۂ جدید کے فن کار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی نے انھیں ماڈرن مرزا غالب (غالب ثانی) بتایا۔ اردو، ہندی، مراٹھی، تامل، پنجابی، تلگو، گجراتی، انگریزی، سندھی اور بنگالی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کی طرف سے علاحدہ تحفے کرشن چندر کو پیش کئے گئے۔

(سیاست)



ڈاکٹر وارث کرمانی

رفتار

ترقی پسند تحریک کے بعد جو نیا رجحان اردو ادب میں آیا ہے اسے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی شکوک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور عجیب عجیب انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں اکثر حضرات اسے مغربی ادب کی نقالی پر محمول کرتے ہیں کچھ لوگ ترقی پسند تحریک کا حریف بنا کر اسے پیش کرتے ہیں اور اسے اتنی دور تک کھینچتے ہیں کہ بات ادب سے سیاست تک پہنچ جاتی ہے یعنی ان کو باقاعدہ وہ اکھاڑے نظر آتے ہیں جن کی پشت پناہی دنیا کی دو بڑی طاقتیں نہایت پراسرار اور درپردہ انداز سے کر رہی ہیں ضعیف العمر طبقہ اس رجحان کو نوجوانوں کی کج بازی یا کج روی سے تعبیر کرتا ہے اصول پرست اور گھر گرہست قسم کے لوگ اسے ذہنی بیماری یا آوارگی سمجھتے ہیں اور اردو ادب کی مکمل شفایابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ہمارے ادب کے ایک ارتقائی عمل اور اس کی قدرتی تبدیلی کو جو تاریخی اعتبار سے بالکل نارمل ہے ایسی بھانت بھانت کی تعبیریں کیوں مل رہی ہیں اور وہ کیا مخصوص عوامل ہیں جنھوں نے ہمیں خود اپنے ادب پاروں کو ان کے اصل رنگ و آہنگ میں دیکھنے اور پہچاننے سے باز رکھا ہے بظاہر تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جدید شاعری کے نام سے جو چیزیں چھپتی ہیں ان میں خاص تعداد ایسی ہوتی ہے جو بدنام کرنے والی ہے اس پر آئندہ قسط میں تفصیل سے لکھا جائے گا لیکن ایک دوسری اور زیادہ تشویش ناک وجہ یہ ہے کہ خود جدید شاعری کے بعض علمبردار اس ناسعادتہ پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اپنی تاویلیں اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ بحث معترضین کے حسب منشا ہوتی ہے یعنی یہ لوگ ایسی لڑائی لڑتے ہیں جس میں نہ صرف جگہ اور وقت کا تعین مخالف سمت سے ہوتا ہے بلکہ دلائل یا طریقہ جنگ بھی معترضین کے انتخاب کا ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی طرف سے مغرب کی تقلید کا الزام لگایا گیا تو یہ نقاد چراغ پا ہو کر مشرق کے ادب کو برا کہنے لگتے ہیں اگر کسی نے جدید شاعری کو مہمل کہا تو جواباً یہ قدیم شاعری کے تمام سرمائے کو مبالغہ، کذب، افترا اور مضحکہ قرار دینا ضروری سمجھتے ہیں اس پر دستار پوش علماء اور بھی مسرور و محظوظ ہوتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کے خلاف اسے تحریری ثبوت میں پیش کرتے ہیں اس بحث و تکرار سے نقصان شعر و ادب کا ہوتا ہے جس کی صحیح صورت گرد و غبار میں چھپ جاتی ہے جدید نقادوں کو اس معاملہ میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم موجودہ ادبی رجحان کو خارجی یا اجنبی مان کر اسے اپنی سرزمین اور اپنے ماضی سے علیحدہ نہیں سمجھتے اگر ایسا ہوتا تو اردو ادب کے بعض معتبر نقاد جو اس تبدیلی سے پہلے ہمارے ادب کی سربراہی کر چکے ہیں آج نئے رجحان کے ساتھ نہ ہوتے اور اس کا خیر مقدم نہ کرتے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ادب کو ایک سلسلہ ماننے پر مجبور ہیں جو نہ صرف حال سے ماضی تک پھیلا ہوا ہے بلکہ اپنے اندر ایک زبردست اشتراک بھی رکھتا ہے جس کی بنا پر سلسلہ کی کڑیاں بکھرنے نہیں پاتیں ہاں وقت اور حالات سے متاثر ہو کر تازہ شکل و شمائل سے آراستہ ہوتی رہتی ہیں فارسی کا یہ شعر جدید ادب کی وادی بھی اشارے سے خالی نہیں۔

من اند اندیشہ راہی شناسم　　　بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

جدید شاعری پر جس قسم کے اعتراضات عام طور سے ہوتے رہتے ہیں ان کے کچھ نمونے اوپر لکھے جا چکے ہیں ان میں پہلا اعتراض مغرب کی تقلید کا ہے۔ ایسے معترضین کو یہ سمجھانا ضروری ہے (اس لئے کہ ہمیں ان کے خلوص پر شبہ نہیں) کہ جدید شاعری مغرب کی تقلید نہیں بلکہ اس تقلید سے آزاد اور دست بردار ہونے کی علامت ہے غالب کی فارسی مثنوی[1] "صاحبان انگلستاں را نگر" سرسید کی نثری تحریریں اور حالی کے ادبی نظریات سے "پیروئ مغرب" کی ابتدا ہوتی ہے جس نے بیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے تک پہنچتے پہنچتے شعر و ادب کو سماجی و سیاسی مقاصد کا آلۂ کار بنا دیا۔ جدید شاعری نے مفاد عامہ کے اس مجلسی انداز کو ترک کرکے (جو اٹھارھویں صدی کی گھٹیا انگریزی شاعری کی تقلید میں تھا) اپنی ہی سرزمین کے عالمگیری عہد کی طرف مراجعت کی ہے اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے میں اپنے ایک دوسرے مضمون "جدید شعری تنقید"[2] میں کر چکا ہوں اس مضمون میں عالمگیری عہد کے عظیم شاعر بیدل کو موجودہ شعری رجحانات کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے جس نے اچھے شعر کی تعریف "شعر خوب معنی ندارد" کے الفاظ میں کی تھی۔ بیدل کا کلام تمام تر کشف و ابہام کی کیفیتوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہندوستان سے باہر روس اور خراسان میں اس عظیم المرتبت شاعر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ہمارا تو یہ حال ہے کہ اگر غالب درمیان میں نہ ہوتے تو شاید ہمیں اس نام ہی کا علم نہ ہوتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کلام بیدل میں تامل و تفکر، خود نگری و خود فراموشی اور ذات و صفات کی وہ تمام حیرت انگیزیاں پائی جاتی ہیں جن کی ایک جھلک آج کی جدید شاعری میں نظر آتی ہے یہ اشعار دیکھئے

چنیں کشتۂ حسرت کیستم من　　　کہ چوں آتش از سوختن زیستم من
نہ شادم نہ محزوں نہ خاکم نہ گردوں　　　نہ لفظم نہ مضمون چہ معنیستم من
اگر فانیم چیست ایں شور ہستی　　　وگر باقیم از چہ فانیستم من
بنازاے تخیل بنال اے توہم　　　کہ ہستی گماں دارم و نیستم من

بگویم دیرانم می پویم دگر یابم　　　حرفی کہ نمی فہمم راہی کہ نمی دانم

بیدل کے آس پاس اور بعد میں آنے والے اردو شاعروں میں بھی عام طور سے یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ کی غزل میں بیشتر

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

[1] غالب نے یہ مثنوی سرسید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی تھی جو کلیات فارسی میں "تقریظ آئین اکبری" کے عنوان سے شامل ہے۔

[2] یہ مضمون شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی میں جدیدیت پر سیمینار کے موقع پر پڑھا گیا تھا اب سیمینار کے دوسرے مضامین کے ساتھ چھپ رہا ہے۔

تبصرہ

محمد انصار اللہ نظر

وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت

مصنف: سید شاہ فرزند علی صوفی منیری تلمیذ غالب

مرتب: ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

ملنے کا پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴

اردو میں صوفیائے کرام کے جو چند تذکرے لکھے گئے انھیں میں سے ایک وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت بھی ہے جس میں حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور ان کے سلسلے کے بائیس خلفا کے حالات درج ہیں اس کے مصنف سید شاہ فرزند علی صوفی منیری تھے جو خود بھی اسی سلسلے سے وابستہ تھے۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تذکرہ ۱۳۰۱ھ میں لکھا گیا پھر ۱۳۰۳ھ اور ۱۳۲۲ھ میں پٹنہ سے اور ۱۹۶۱ء میں چاٹگام سے چھپ کر شایع ہو چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر محمد طیب ابدالی صاحب نے اسے چوتھی مرتبہ مرتب کر کے شایع کیا۔ دیباچہ میں لکھا ہے:

> "میں نے اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ مطبوعہ اور قلمی نسخے جو دستیاب ہو سکیں ان سب کو سامنے رکھ کر ایک صحیح ترین متن تیار کیا جائے جو موجودہ اصول تحقیق کے مطابق بھی ہو اور صحیح ترین بھی اس سلسلے میں میں نے تمام مطبوعہ نسخوں اور غیر مطبوعہ نسخے سے استفادہ کیا ہے"

سرورق پر بھی "بہ تصحیح و تحشیہ" لکھا ہوا ہے لیکن حیرت ہے کہ کتاب میں کہیں بھی اختلاف نسخ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا یہ بات کہ ان نسخوں میں کہیں کوئی فرق نہیں تھا اس لئے قابل یقین نہیں کہ خود فاضل مرتب نے فرمایا ہے کہ وہ بہترین متن شایع کر رہے ہیں۔ متن کے ان اختلافی مقامات کی جو مرتب کے معیار کے مطابق "بہترین" نہ تھے، اگر نشاندہی کر دی جاتی تو شاید قارئین کو کچھ زیادہ فائدہ ہوتا۔ اقتباس بالا کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ اس میں "صحیح ترین" کی تکرار اور "صحیح ترین کے ساتھ" "ایک" کی تخصیص (صحیح ترین تو ظاہر ہے ایک ہی ہوگا) کھٹکتی ہے کتاب کے حواشی میں زبان و بیان کی اس نوعیت کی خامیاں کئی جگہ نظر آتی ہیں مثلاً

"اس کا دو قلمی نسخہ کتب خانہ (شاہ) فرزند سید بلخیہ فتوحہ پٹنہ میں ہے" (ص۹)

"مزارات .... آپ کے افراد اہل خاندان کے معلوم ہوتے ہیں" (ص۲۲)

"تبلیغ اسلام کے لیے بادہ پیمائی کی" (ص۱۶)

بعض الفاظ کا املا بھی محل نظر ہے مثلاً "شادان" کو "ستادن" (ص۲۳) اور "یحییٰ" کو "یحیٰ" (فہرست مضامین اور دوسرے تمام مقامات پر) لکھا ہے اسی طرح متن و حواشی میں بعض جگہوں پر فاضل مرتب سے سہو ہوا ہے مثلاً

"در زبان سلطنت پادشاہ" (حاشیہ ص۲ سطر ۱) "زمان" چاہئے۔ "حسب آنفرمودہ شیخ" (حاشیہ ص۲ سطر ۱۴) یہ "حسب الفرمودہ" ہے۔

متن کی کتابت کے سلسلے میں املا کی وہی روش برقرار رکھی ہے جو اس زمانے میں رائج تھی .... تاکہ متن میں کسی قسم کی تحریف کا الزام مرتب پر نہ آئے" احتیاط کی یہ صورت اچھی ہے لیکن آج جو املا مروج ہے آج کے قاری کے لئے وہی مفید تر بھی ہے قدیم املا سے قاری کو دقت بھی ہو سکتی ہے اور شبہ بھی مثلاً

"بار سلطنت اوس کی دوش پر رکھا" (ص۱۰)

آج کے قاری کے لئے "اوس کی" کو "اس کے" پڑھنا دقت طلب ضرور ہے۔ جب مصنف کے املا کی توضیح ہی مقصود تھی تو اس کا ذکر دیباچہ میں کر دینا کافی تھا۔

واقعات کے زمانہ و تاریخ کے اندراج میں بھی بعض مقامات پر فرق آتا ہے مثلاً صفحہ ۲۹ (سطر ۱۸) پر شیخ احمد چرمپوش کی بابت لکھا ہے "آپ کا وصال ۷۷۶ھ میں ۲ صفر المظفر کو ہوا" پھر اسی صفحہ (کی سطر ۲۰) پر شیخ ارشدی کے حوالے سے ہے کہ "حضرت۔ چرمپوش بہاری المتوفی ۷ ۲ صفر" یہ چند فروگذاشتیں ہیں جو اگر نہ ہوتیں تو اچھا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس تذکرے کے حواشی لکھنے میں فاضل مرتب نے جو محنت اور کاوش کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اتنے مآخذ تک رسائی حاصل کرنا اور ان سب سے استفادہ کے بعد اپنے مفید مطلب مواد فراہم کر لینا جتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے اس نوعیت کا کام خود بھی کیا ہو۔ اس تذکرے کی ترتیب کا کام اس لحاظ سے بھی مشکل تھا کہ صوفیا کے تذکرے کم ملتے ہیں اور جو ملتے ہیں ان میں بیشتر ان کی کرامتوں کا بیان ہوتا ہے۔ واقعات اور کام کی باتیں نسبتاً کم ہوتی ہیں شیخ ذوقؔ نے اچھا طنز کیا ہے:

> ان کو ہے پرعرش اعظم پر اڑاتے ہیں مرید کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پر کے

ڈاکٹر محمد طیب ابدالی صاحب مبارکباد کے قابل ہیں کہ انھوں نے اس تذکرے کے حواشی لکھنے میں مبالغہ آرائی اور بے جا عقیدت مندی سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی ہے اور واقعات کے بیان میں عملی طرز استدلال اپنایا ہے۔ اور اس طرح یہ تذکرہ علم و ادب کے طالب علموں کے لئے اب ایک مفید اور کارآمد کتاب ہو گیا ہے ضرورت ہے کہ صوفیا اور ادبا کے دوسرے تذکرے اور ان سے متعلق دوسری تصانیف بھی علمی انداز سے مرتب کر کے پیش کی جائیں۔ ان بزرگوں کے تذکرے میں ہمیں اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ سب انسان تھے اور ان کی بزرگی کا راز بھی یہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی صاحب نے صوفی منیری کی تمام نثری تصانیف کو نئے سرے سے مرتب کر کے شایع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے خدا انھیں ان کے مقصد میں کامیاب کرے۔